© rasailojaraid.com

چودھویں قسط

حسرت

جناب عابد رضا صاحب بیدار رام پور

رہائی کے وقت منجانب پولیس جو اہتمامات کئے گئے تھے ان کا معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ حکومت کے نزدیک حسرت کا وجود اس قدر خطرناک سمجھا گیا تھا کہ جیل کے گرد و پیش تمام سڑکوں اور ناکوں پر پولیس کا باقاعدہ پہرا قائم کر دیا گیا تھا تاکہ کوئی پرندہ پر تک نہ مار سکے۔

ہمدم اور جمہور کے نامہ نگاروں نے لکھا ہے کہ مسلح پولیس کا اس قدر شاندار انتظام کیا گیا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ گویا وائسرائے یا کوئی ایسا ہی افسر اعلیٰ اس طرف سے گزرنے والا تھا۔ اس ناکہ بندی اور پہرا چوکی کا یہ اثر ہوا کہ میرٹھ کی کمزور طبیعت مخلوق سہم کر رہ گئی اور کسی کو یہ جرأت نہ ہوسکی کہ وہ حسرت کے استقبال اور پذیرائی کے لئے آگے بڑھتا۔ خدا معلوم حسرت کے وجود کے اندر وہ ایسی کیا خوفناک قوتِ برق موجود تھی جو اُن سے نکل کر خرمن امن و امان کو نذر آتش کر دیتی۔

۱۳۴۲ھ میں " سلسلہ نظربندان اسلام : نمبر۳ " کے طور پر حالات حسرت کے نام سے صدر دفتر انجمن اعانت نظربندان اسلام دہلی نے ۷۰ صفحات پر مشتمل ۲۲×۱۸ سائز پر ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں علاوہ دوسرے معتبر ماٰخذ کے بیگم موہانی کے مہیا کئے ہوئے تحریری سواد سے کافی مدد لی گئی تھی۔ یہ کتابچہ جو غالباً عارف ہسنوی کا لکھا ہوا ہے حسرت کی زندگی کے پہلے نصف پر معتبر ترین ماٰخذ کے طور پر استعمال ہوسکتا ہے۔ میں نے مندرجہ بالا سطروں میں " حالات حسرت " کا خلاصہ پیش کیا ہے اور خلاصہ اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ سارے جملے اور الفاظ اسی کے ہوں۔ میرا اپنا ایک لفظ نہ ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مئی ۱۹۱۸ء سے نومبر تک نیم نظر بندی نیم آزادی کا زمانہ گزرا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۰ء کے نصف اول تک علی گڑھ میں مقیم رہے اور اس کے بعد ۱۹۲۱ء تک کے آخر تک کانپور میں۔ اپریل ۱۹۲۲ء میں قید فرنگ ثالث شروع ہوئی جس سے پہلے ان کا مسلم لیگ کا خطبۂ صدارت (۱۹۲۱ء) ضبط کیا جا چکا تھا۔ مگر اس بار رہائی کی نوبت جلد ہی آگئی۔

اس کے بعد ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء تک جب لکھنؤ میں آستانۂ یار پر انھوں نے آخری سانس لی، ان کی بیوی بچوں والی زندگی سے قطع نظر حسرت کا سماجی رول کچھ ایسا ممتاز نہیں رہا جس نے ہندوستان یا اسلامی ہند پر کسی بھی پہلو سے اپنی چھاپ چھوڑی ہو۔ حالانکہ اپنی جگہ پر یہ بھی واقعہ ہے کہ شاید ہی کوئی دن ایسا گذرا ہو جب قوم کے درد نے اُن کے دل میں ٹیسیں نہ اُٹھائی ہوں۔

۱۹۲۱ء میں کانگریس کے پلیٹ فارم سے حسرت نے مکمل آزادی کی جو تجویز پیش کی جو اس وقت کانگریس کے قائدوں کو کچھ قبل از وقت یا کچھ انقلابی سی لگی۔ تجویز پاس نہ ہو سکی۔ لیکن حسرت اپنی بات پر جمے رہے۔[۱] گاندھی جی کا عدم تشدد ہر موقع پر انھیں پسند نہ تھا۔ کانگریس کا نرم رویہ اُن کی سلگتی ہوئی طبیعت کے لئے موزوں نہ تھا۔ وہ تو آگ تھے، ایسی آگ جسے نہ کانگریس برداشت کر سکی نہ مسلم لیگ، نہ جمعیتہ، نہ کمیونسٹ پارٹی، وہ سب پارٹیوں میں رہ کر بھی کسی ایک کے نہ بن سکے۔

کانگریس سے ۱۹۰۷ء میں برگشتہ ہوئے اور تلک کے ساتھ اسے چھوڑ دیا۔ ترک موالات میں پھر ایک بار وہ کانگریسی تھے، پھر ایکا ایکی کمیونسٹ بن گئے، پھر مسلم لیگی۔ پھر لیگ بھی اُن کے ساتھ نہ چل سکی۔ لیکن تھوڑے دن بعد وہ پھر لیگ ہی میں واپس آگئے۔ پاکستان بنا تو وہ لیگی تھے، لیکن پاکستان نہیں گئے۔

گاندھی جی، جناح صاحب، جواہر لال، محمد علی، ابوالکلام، وہ سب کے ساتھ تھوڑی دور چلتے اور پھر الگ ہو جاتے۔ وہ فطرتاً کسی کے ساتھ بھی نہیں چل سکتے تھے۔

---

[۱] رپورٹ نیشنل کانگریس منعقدہ احمد آباد، مع روئداد مسلم لیگ، مرتبہ شیخ اللہ دیا صوفی نقشبندی المجددی۔ شیخ محمد رشید تاجر کتب لاہور ص ۲۲-۲۳، ص ۲۸-۲۹، ص ۳۰-۳۱، ص ۳۸-۳۹، ص ۴۶-۴۷، ص ۴۸-۴۹، ص ۵۲-۵۳، اور ص ۶۰-۶۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انقلابی صرف انقلاب کے ساتھ چل سکتا ہے، جو بھی اس راہ میں جس حد تک اس کا ساتھ دے سکا۔

ان کا نہ مذہب کا گہرا مطالعہ تھا، نہ سیاست کا، نہ کیمونزم کا۔ وہ اپنے گرد و پیش کی محدود سیاست کو ساری سیاست سمجھتے تھے، اُردو شاعری کو سارا ادب سمجھتے تھے، اور جس تحریک سے وابستہ ہو جاتے تھے اُس کو سارے عالم کا مرکز و محور سمجھنے لگتے تھے، صداقت کی لگن ہونے کے باوجود صداقت کی پرکھ میں ان کی نگاہ چوک جاتی تھی۔ اُن کی وسیع النظری کی قسم کھائی جا سکتی ہے، پر ان کی وسعتِ نظر کے بارے میں ایک سے زیادہ بار سوچنا پڑیگا۔ ان میں کوہکن جیسا عزم تھا، لیکن کوہکن جیسی معصومیت بھی تھی جو بیسویں صدی کی چیز نہ تھی، ابو الکلام کے عزم اور حسرت کے عزم میں یہی فرق ہے اور ان دونوں کا اس حیثیت سے تقابلی مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایک کو زندگی نے سب کچھ بخش دیا اور دوسرے نے زندگی کو اپنا سب کچھ سونپ دیا۔ ایک نے جب سے زندگی شروع کی اُبھرتا ہی چلا گیا۔ اور دوسرا اُبھرا اور ڈوبا اور پھر ابھرا[1] پھر ڈوبا اور پھر تو ڈوبتا ہی چلا گیا، جہاں اسے زندگی اور دنیا بھول گئی۔ بس ایک چیز ہے جسمیں حسرت کا کوئی ثانی نہیں اور وہ ہے نظریہ اور عمل میں خلوص اور صداقت کا بھرپور مظاہرہ[1]۔

---

[1] خلوص اور صداقت سے عملی زندگی میں انتھک اور بے نہایت وابستگی کے متعدد ثبوتوں سے قطع نظر ان کی تحریروں میں جا بجا صدق و خلوص سے ان کی شیفتگی جھلکی پڑتی ہے۔ بلا کسی خاص تلاش کے ضمناً مجھے تین اقتباسات ملے ہیں ملاحظہ ہوں:

"معائب سخن کے متعلق پہلے ارادہ تھا کہ صرف مثالیہ اشعار بلا نام شاعر لکھ دیئے جائیں۔ مگر بعد میں اپنے صدق و خلوص پر بھروسہ کر کے ہر شعر کے ساتھ شاعر کا تخلص بھی ظاہر کر دیا۔۔۔ اس سے ان کی توہین یا تنقیص کسی طرح مقصود نہیں ہے جس کا پہلا ثبوت یہ ہے کہ راقم نے اپنے اشعار کو بھی معائب کی مثالوں میں بارہا پیش کیا ہے۔"

(دیباچۂ نکات سخن)

"میرے اپنے عقائد اور اعمال جو کچھ بھی ہوں۔ میں دوسروں کے عقائد اور اعمال کا بھی قائل ہوں، بشرطیکہ اُن میں خلوص اور صداقت ہو" (مجنوں گورکھپوری کا مقالہ در اردوئے ادب) میں منقول)

"جذباتِ روحانی تو درکنار، ہم یہ کہتے ہیں کہ داغ نے خواہشات نفسانی کی بھی صحیح تصویر (باقی آئندہ صفحہ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضمیمے

ضمیمہ (۱)

جو آزادی بطور تحفہ حاصل ہوتی ہے وہ بہت جلد نابود ہوجاتی ہے۔ اس کے برخلاف جو آزادی نتیجہ ہو جہد و کشمکش کا، اس کے دیرپا ہونے میں کوئی بھی شبہ نہیں کرسکتا۔

(اُردوئے معلیٰ اگست ستمبر ۱۹۰۷ء)

•

انیسویں صدی میں ہمارے پولیٹیکل ایجی ٹیشن کا دائرہ بالکل محدود تھا۔۔ لیکن جس وقت سے اہل ہند کے دلوں میں حریت اور قومیت کی آگ روشن ہوئی ہے ان کو صاف معلوم ہوگیا ہے کہ سیلف گورنمنٹ کے بغیر کچھ فائدہ نہیں ہوسکتا ... اصلی علاج خرابیوں کا سیلف گورنمنٹ کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا جبکہ ٹیکس لگانے کا اختیار صرف جمہور کو ہوگا۔

جب تک ہمارے مطالبوں کا دائرہ تنگ تھا اس وقت تک بے شک عرضداشتوں اور شکایت ناموں سے بھی کچھ کام نکلتا رہا لیکن جبکہ ہم نے سوراج کو علانیہ اپنا پولیٹیکل مذہب بنا لیا ہے تو اب گداگری کی قدیم پالیسی پر قائم رہنا اول درجے کی نادانی ہے۔ (اردوئے معلیٰ۔ ایضاً)

•

اگر برٹش حکومت ہند سے کچھ فوائد مترتب بھی ہوئے ہیں تو ان کی حیثیت محض اتفاقی یا اضطراری فوائد کی ہے جن کی بابت کسی پارٹی یا گورنمنٹ کا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ انگریزی تعلق سے ہندوستان کو کیا کیا فائدے پہونچے ہیں بلکہ صرف دیکھنا یہ ہے کہ اہل

بقیہ صفحہ گذشتہ - بہت کم کھینچی ہے۔ جرأت اور انشا کے یہاں اس قسم کے خیالات میں چونکہ صداقت کا رنگ موجود ہوتا ہے اس لئے ان کی غیر متین اور غیر مہذب شاعری بھی حسن سے خالی نہیں کیونکہ حسن و صداقت کا لازم و ملزوم ہونا ضروری ہے (مکاتیب امیر مرتبہ ثاقب پر ریویو۔ اردوئے معلیٰ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہند کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کا برتاؤ نیک نیتی پر بھی مبنی تھا یا نہیں ۔ (اردوئے معلیٰ مئی ۱۹۰۷ء)

•

پولیٹیکل میدان میں در آنے کے بعد جس وقت اُن کے جذبۂ حریت میں تحریک پیدا ہوگی اس وقت مسلمان بھی محض انگریزوں کی اطاعت وخدمت کے افتخار پر قانع نہ رہ سکیں گے ..... مسلمانوں کی موجودہ پالیسی کیوں کمزور ہے اس کے بہت سے اسباب ہیں ۔ مثلاً (۱) تعلیم کی کمی (۲) دولت کی کمی (۳) آغاز حریت کی قدرتی جھجک (۴) ملازمت سرکاری کا بآسانی ملجانا (۵) دیگر اقوام ہند کے ساتھ رقابت کا جوش وغیرہ ۔ لیکن بزمانہ آئندہ ان تمام اسباب کمزوری کا دور ہوجانا بھی یقینی ہو اُس وقت حکومت غیر کے حرو بے انصافی کی ان کو بھی ویسی ہی شکایت پیدا ہوگی جیسی کہ اس وقت دوسری آزاد قوموں کو ہے اور جب اس طرح پر ان کی آنکھیں کھل جائیں گی تو ہندوستان کی رقابت اور بے اعتمادی بھی بہت کچھ کم ہوجائے گی اور پولیٹیکل حیثیت سے تمام باشندگان ہند کے ساتھ ایک متحدہ قوم بن کر یقیناً اس حق کے دعویدار ہونگے کہ ہندوستان صرف ہندوستانیوں کے لئے ہے اور اس دعویٰ میں ہندی مسلمان بھی یقیناً شریک ہونگے کیونکہ سلف گورنمنٹ حاصل نہیں ہوسکتی جب تک ہندو مسلمان متحد نہ ہوں (اردوئے معلیٰ ۔ جون ۱۹۰۷ء)

•

مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی

انگریزوں سے بڑھ کر شاید ہی کوئی قوم دوسرے ملکوں پر حکومت کرنے میں مشاق ہو ۔ یہ لوگ جس ملک پر تسلط کرتے ہیں پہلے ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہاں کے باشندے مطمئن رہیں اور اپنے حکمرانوں کو اعتبار کی نظر سے دیکھنے لگیں ۔ اس کے بعد یہ لوگ اپنے ہاتھ دکھاتے ہیں ۔ سب سے پہلے کوشش ان کی حکمراں جماعت کی یہ ہوتی ہے کہ محکوم قوموں اور ملکوں میں اپنی حالت سنبھالنے کا احساس نہ پیدا ہونے پائے ۔ جہاں تک ہوسکے محکوم قومیں آپس میں لڑتی جھگڑتی رہیں اور ہمدرد بنی نوع انسان ان کی باہمی عداوت سے خوب فائدہ اٹھائیں ۔ محکوم قوموں کی قومی بقا کو تباہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے کی جو کوششیں انگلستان نے کی ہیں شاید ہی کسی نے کی ہوں۔

قومی ترقی کے اسباب کو ایسے غیر محسوس ذریعوں سے روکا کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی مگر ان کی پالیسی اپنا اثر کر گئی۔ لاریب جب ایک حکمراں قوم اپنے محکومین کے مستقبل سے متعلق اپنا کوئی خاص مدعا قرار دے لیتی ہے تو ایک نہ ایک دن وہ پورا ہی ہو کر رہتا ہے۔ مسلمانوں کو سلطنت انگلستان سے ٹرکی کے بعد سب سے گہرا تعلق ہے اور اگر انگریز مدبروں میں مسٹر بارٹلٹ آنجہانی کے خیال کے لوگ پیدا ہوتے رہتے تو غالباً دونوں قوموں کے تعلقات دوستانہ ہو جاتے۔ مگر اس وقت سب سے زیادہ نقصان ہم مسلمانوں کو انگریزوں ہی سے پہنچا ہے۔ سلطنت ٹرکی پر تباہی کے انگریز ہی بانی ہیں۔ کریٹ اور مقدونیا کے معاملات میں سب سے پہلے انگریز ہی ثالث بنتے ہیں۔ مصر اور ہندوستان کے مسلمانوں کے ملکی وجود کو تباہ کرنے میں انگریز ہی سرگرم نظر آئیں گے۔ عربی پاشا جو مصر کی آزادی اور نئی روشنی کا حامی اور نئے خیالات کا لیڈر تھا، کیا وہ اس لائق تھا کہ جلا وطن کیا جائے۔ سیلون سے گو وہ مصر میں آگیا، مگر ایک کشتی میں قید ہے اور اپنی زندگی کے باقی ایام کو نہایت حسرت اور یاس کی حالت میں دریائے نیل میں بسر کر رہا ہے، قاہرہ آنے کا حکم نہیں غریب کی معاش کا نہایت ہی ناکافی بندوبست ہے۔

مصر میں انگریزوں نے ۱۸۹۰ء تک رہنے کا وعدہ کیا تھا اور انگلستان کی عزت کا حلف اٹھایا تھا۔ مگر آج جاتے ہیں نہ کل۔ بلکہ روز بروز قدم جمتے جاتے ہیں، اس پر بھی بس نہیں کرتے بلکہ مصر کی قومی ترقی اور نموئے ملی کو بھی غارت اور تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انگریزوں کے قدم آتے ہی تعلیم میں کمی آگئی گو آبادی میں تیس لاکھ کا اضافہ ہوا اور آمدنی پہلے کی نسبت چھ گنی ہو گئی۔

ذیل میں ہم ایک فہرست لکھتے ہیں جس سے تعلیم کو جو نقصان انگریزوں کے قبضۂ مصر سے پہنچا ہے واضح ہو جائے گا۔

۱۸۷۲ء تک متعلمین کی تعداد ۱۹۴۷۰ تھی (انگریزوں سے پہلے) ۱۸۸۹ء میں یعنی انگریزوں کے دخل کے ساتھ ہی ۱۵۷۱۳ رہ گئی اور بالفعل یعنی ۱۹۰۵ء میں کم سے کم ہوتے ہوتے ۲۲۲۰۳ پر آ پہنچی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہلے ملک میں ۲۲ مدارس تھے مگر اب صرف ۵۰ ہیں۔

متذکرہ بالا شمار اعداد سے انگریزوں کی نیک نیتی اور قبضے کے مفید اثرات کا خوب پتہ چلتا ہے اور ضمناً کرومر کے اس وعدے کی تصدیق ہوتی ہے کہ "میں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ فلاحین مصر کی فلاح اور بہبود میں صرف کیا ہے۔"

ظاہر ہے کہ ہر قوم کی ترقی تہذیب و شائستگی کا اندازہ اس کی تعلیمی حالت سے ہوتا ہے اور تعلیم ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی بدولت ملک و ملت، ذلت و خواری کی کینچلی اتار پھینکتے ہیں۔ مگر مصر میں باوجود انگریزوں کی تعلیم کے باب میں سدِّراہ ہونے کے، تعلیم پھیلتی جاتی ہے۔

ہرچند کہ کرومر نے فیس بڑھوادی اور سررشتہ تعلیم کا خرچ کم کردیا، مگر وہ تعلیم کی عام خواہش کے اور آزادی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو نہ روک سکا۔ پہلے زمانہ میں یعنی ہمدردان بنی نوع بشر کی تشریف آوری سے پہلے مصر کے سررشتۂ تعلیم کا خرچ ایک لاکھ تیس ہزار پونڈ تھا۔ مگر انگریزوں نے رعایا کی خیراندیشی کے خیال سے گھٹا کر ۲۳ ہزار پانسو پونڈ کردیا اور اس میں نصف فیس کی رقمیں بھی شامل ہیں۔ سررشتہ تعلیم میں ناقابل اور ناواقف لوگ بھرتی کئے جاتے ہیں۔ تعلیم کے انتظامی مناصب کا بندوبست انگریزوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ غور کا مقام ہے کہ انگریز مصر کی ضروریات کیا خاک سمجھ سکتے ہیں اور ملکی زبانوں سے نابلد اشخاص تعلیمی مسائل کی مقامی دقتوں کو کیونکر حل کرسکتے ہیں۔ انگریز جنھیں برسوں ہندوستان میں جھک مارتے گزر جاتے ہیں اُردو تک ٹھیک نہیں بول سکتے۔ اُن سے یہ کیونکر توقع کی جائے کہ ان لوگوں کو مصر کا چند روزہ قیام زبان عربی کا ماہر بنادے گا۔ جس کے رموز اور نکات سوائے اہل زبان کے کوئی شخص چاہے کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو نہیں جان سکتا۔ اس وقت مصر کو تحصیل علم و آزادی کے لئے جدوجہد کرتے دیکھ کر جب ان ہمدردان بنی نوع بشر کا دل کڑھنے لگا تو ناں تعلیم کو روکنے کے لئے چالبازی سے بڑھ کر جبر و تشدد سے کام لینا شروع کردیا۔ چنانچہ اب مصر میں یہ تجویز ہو رہی ہے کہ علوم و فنون کا درس حسب سابق عربی میں نہ دیا جائے۔ عربی زبان نے اپنی وسعت کی وجہ سے آجتک یورپ کے تمام علوم کو جگہ دی تھی اور مغربی اثر نے اس کی روح کو تازہ کردیا تھا۔ ملک میں زیادہ تر علوم اسی زبان میں پڑھائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاتے تھے) ظاہر ہے کہ کوئی ملک ادبی ذخائر سے اس وقت تک مالا مال نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ ملک میں اخذ کی قابلیت نہ ہو اور غیر سرمایہ اس میں جمع نہ ہو جائے۔ انگریزی زبان کی تاریخ ہی کو دیکھو۔ اگر اس میں فرانسیسی اور لاطینی علم و ادب کا اثر نہ ہوتا تو یہ بھی چند وحشی زبانوں کی طرح سے ہوتی۔ عربی زبان کی یہ ترقی اور اس میں نئی جان پڑتی دیکھ کر کرو مر جیسے مصر کے خیر اندیشوں سے نہ رہا گیا۔ چنانچہ مسٹر ڈنلوپ وزیر تعلیم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ زبان عربی میں علوم و فنون نہ پڑھائے جائیں۔

انھوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ چونکہ عربی زبان اپنے موجودہ زمانے کی اصطلاحات کے لئے ناکافی ہے اور غیر وسیع ہونے کی وجہ سے اس میں علوم مغربیہ کی تعلیم بالکل وجہ نہیں ہو سکتی۔ مصر کے ان جار اللہ زمخشری کا یہ دعویٰ ایسا لچر ہے کہ اس کی تردید فضول ہے۔ کیونکہ جس شخص کو عربی زبان سے ذرا سا بھی مس ہے یا جس نے جرمن محققین کی رائیں پڑھی ہیں وہ ڈنلوپ صاحب کے اس دعوے کی صداقت کو خوب سمجھ سکتا ہے۔ کاش کہ اہل مصر کو یورپین زبانوں ہی میں تعلیم دی جاتی۔ مگر نہ صرف تعلیم کا انتظام ناکافی ہے بلکہ اس کے اصول میں بہت سے عوائق پیدا کئے جاتے ہیں۔ مدارس کا کورس نہایت بیکار اور لغو ہے اور کسی کی تعلیم مکمل طور پر نہیں دی جاتی۔ مصر میں امریکہ اور فرانس کے آزاد مدارس ہیں مگر اُن کی سند ریں تسلیم نہیں کی جاتیں۔ لیکن یہ بات قابل اطمینان ہے کہ مصر میں علم کی خواہش اور آزادی کے خیالات دن بدن ترقی کرتے جا رہے ہیں اور نوجوان مصری یورپ کے مدارس میں تعلیم کے لئے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ہم کو اُمید ہے کہ قومیت کی تعلیم جو مصطفیٰ کامل رحمۃ اللہ علیہ نے اہل مصر کو دی ہے وہ ان کے دل میں ست نئے ولولے اور جوش پیدا کرتی رہے گی اور اسلامی ترقی کا آفتاب وادی نیل سے نمودار ہو کر تمام افریقا، ایشیا اور یورپ کو منور کریگا۔ آمین ثم آمین۔

(از "مسلمان طالب علم") (اُردوئے معلیٰ اپریل ۱۹۰۸ء)

(باقی)

© rasailojaraid.com